شکیل صدّیقی
ایم، آئی، جی۔ ۳۱۷
ٹکیت رائے ایل ڈی اے کالونی لکھنؤ

بیگم حضرت محل

(مردوں کی بالادستی کے عہد کی ایک خاتون کی جدّ و جہد)

نئی عالمی اقتصادی پالیسیوں کے ضروری متبادل کی صورت میں صارفی سرمایہ کاری کا ہولناک منظر، گھریلو معیشت کا بکھراؤ اور بربادی، محنت کے بے رحمی سے استحصال کی صورت میں سامنے آنا سرمایہ دارانہ خرابیوں کے تحت ان کی سفاکی اور اقتدار پسند برائیوں کا نئے انداز میں رونما ہونا موجودہ منظر نامے پر نظر ڈالتے ہوئے اگر ہم ایک سو پچاس برس قبل رونما ہونے والے ۱۸۵۷ء کے عظیم انقلاب، اس کے قائدین کو یاد کریں تو اس انقلاب سے وابستہ ایک اور بھی پہلو نمایاں ہوتا ہے اس میں خواتین کی حصّہ داری ہندوستانی عورت کی درد بھری تاریخ میں ایک روشن باب جوڑتی ہے جسے غیر ملکی غلامی کے خلاف آزادی کی پہلی جنگ بھی کہتے ہیں۔ اسی میں انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہی اور انگریزوں سے نالاں متعدد راجاؤں جاگیرداروں کے اہم کردار کے باوجود اس کے سروکاروں سے بدحال کسانوں، گاؤں اور شہر کے غریب تاجروں کے بنیادی، اقتصادی مسائل بھی جڑے ہوئے تھے۔ برجیس قدر کی طرف سے بیگم حضرت محل کے ذریعہ جاری اعلانیوں میں یہ سوال اپنی موجودگی کا الگ سے احساس کراتے ہیں۔ دلتوں، پاسیوں، کسانوں، گاؤں شہر کے غریبوں کا اس جنگ میں کود پڑنے کا پس منظر اور جاہے جو وجہ رہی ہوں اس کی ایک وجہ اقتصادی بھی تھی۔ آج بھی کچھ اس طرح کے حالات ہیں۔ نوآبادیاتی تشکیلات میں کسان خودکشی کر رہے ہیں۔ نوجوانوں میں اندھی مقابلہ آرائی دولت اور آسائشوں کو جمع کرنے کی ہوڑ کی نفسیات رونما ہو رہی ہے۔ آج جدوجہد ہوتی تو یہ لوگ جنگ آزما ہوتے زندگی سے فرار نہ کرتے۔ اقتصادی فاشسزم نے انسانیت کو کس طرح اور کیسا صدمہ پہونچایا ہے اس کو واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا داخلہ اور پھیلاؤ ہندوستانی راجاؤں کی شخصی آمریت اور اپنے حقوق پسندیدہ اجارہ داری کی ذہنیت نیز رجحان کی وجہ سے ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس کے گورے ناظموں کے خلاف عوام میں پھیلے ہوئے غم و غصّہ کے آزادی کی قومی خواہشات بننے کے عمل کے ساتھ زیادہ تر ہندوستانی راجاؤں نے غداری کی۔ باوجود اس کے دیسی راجاؤں کی انھیں قطاروں سے انگریزی غلامی ان کے سرمایہ دارانہ منصوبوں کے خلاف لڑنے والے بھی ابھرے۔ بیگم حضرت محل بھی ایسا ہی ایک نام ہے جبکہ رانی لچھمی بائی کی طرح وہ بھی نسلاً راجا نہیں تھیں اور نہ شاہی کنبہ کی فرد تھیں۔ باوجود اس کے کہنا ہوگا کہ ۱۸۵۷ء کے عظیم انقلاب میں ان کی فعال شرکت ایک شاہی کنبہ کے نمائندے کی حیثیت سے تھی۔

حقیقت یہ بھی ہے کہ روایت سے شاہی خاندان کی فرد نہ ہوتے ہوئے بھی بیگم حضرت محل اور رانی جھانسی دونوں شہنشاہیت کے خاتمہ کے لئے نہیں بلکہ اس کے بقا اور سلامتی کے لئے جنگ کر رہی تھیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ایسا کرتے ہوئے بھی انھوں نے پدرسری سماج اور جاگیردارانہ نظام کی روایتی پابندیوں اور فرسودہ رواجوں کو شکست ضرور دی تھی۔ نامور انگریزی مصنفہ ورجینیا وولف نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ تاریخ میں کچھ گمنام یا غیر شہرت یافتہ ہے، وہ عورت سے جڑا ہوا ہے اور واقعی تاریخ کی تعمیر میں عورتوں

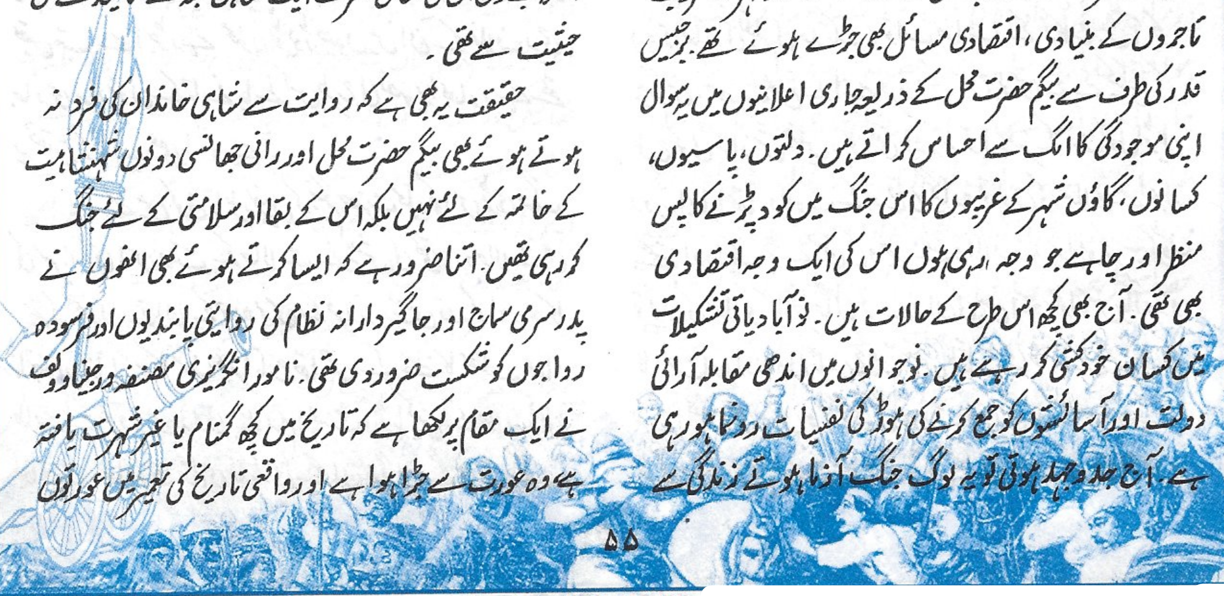

نے فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے باوجود ان کے رول، فعال شرکت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ پھر یہ خواتین اگر غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہوں تو ان دیکھی کی دوہری مار کا کرب برداشت کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انگریزی سامراج مخالف پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے قائدین میں نواب واجد علی شاہ کی پسندیدہ بیگم حضرت محل کے ضمن میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس جنگ کو وسعت دینے میں انھوں نے بڑی جدو جہد کی۔ ناانصافی، دباؤ، غیر ملکی غلامی کے خلاف عوام کے غصّے اور ردعمل کے اظہار کو حقیقت کا روپ دینے۔ انگریزوں کے غاصبانہ وجابرانہ رویہ کے خلاف انھوں نے جو کردار انجام دیا اس عظیم کارنامے کے سلسلہ میں آج تک کوئی سنجیدہ کام ممکن نہیں ہو سکا۔ نتیجہ کے طور پر نہ صرف ہندستانی تاریخ کی ایک اہم جنگ کے کئی محرک کرنے والے پہلو ظاہر ہونے سے رہ گئے بلکہ پردے اور مخصوص شاہی اخلاقی ضابطوں میں جکڑی ایک مسلم خاتون کی جنگ سے متعلق نفسیات اور جنگی صلاحیت ومہارت کی مکمل تصویر بھی سامنے نہیں آسکی۔ ان کے خواب اور اضطرابی کیفیات وخواہشات اور کئے گئے عہد، اپنے فرزند کے حوالے سے اودھ کے اقتدار اور وہاں کی عوام (پسماندہ و دوسرے غرباء کے کچھ طبقوں کو چھوڑ کر) کے لئے کی گئی قربانی، برداشت کی گئی مشکلات کی ضروری تفصیلات بھی بخوبی رقم نہیں ہوئی۔ نیپال میں پناہ لینے کے دوران ان پر کیا کیا گذر گئی یہ سچائی بھی ماضی کی تہہ میں پنہاں ہے۔ وہ جب میدان جنگ میں تھیں تب سے اجڑ رہے محلوں، ڈیوڑھیوں میں ان کے خلاف رچی جا رہی سازشوں کے تانے بانے کس طرح کی تصویر ابھار رہے تھے یہ تحقیق کرنا اب بھی باقی ہے ۔

یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ بیگم حضرت محل کو اس بڑی جنگ کی سربراہی اس وقت کے حالات نے پیش کی تھی۔ وہ حالات ہی تھے کہ جنھوں نے ان کے چودہ برس کے فرزند برجیس قدر کو اودھ کا تاجدار بنایا۔ یہ کانٹوں بھرا تاج تھا جس کے پہننے کا مطلب تھا، طاقت کے غرور میں ڈوبی بے رحم ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف کھلی بغاوت۔ ساتھ ہی شاہی خاندان کے ان لوگوں کے خلاف ایک چیلنج جو تاج کے خواہاں و کمپنی کے خیر خواہ تھے جنھیں برجیس قدر کا بادشاہ بننا اور بیگم حضرت محل کی جدوجہد کی سربراہی منظور کرنا اتنی ہی شدت سے ناگوار گذرا تھا جتنا ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران کو۔ اس کا مطلب یہ قطعی نہیں لینا چاہئے کہ کانٹوں بھرا تاج ان کو جوکھم میں ڈالنے والا یہ راستہ چننے کے پیچھے بیگم حضرت محل کی خواہش اور آرزو کا کوئی دخل نہیں تھا یا انگریزوں کے ذریعہ اودھ کا اقتدار غصب کئے جانے اور ان کے مجبور خاوند کو بادشاہ سے قیدی بنا دینے کے واقعات کا ان پر کوئی مخالف اثر نہیں پڑا تھا۔ ان کا دل ودماغ اس آگ سے روشن نہیں تھا جس کی تپش مختلف راجاؤں راج پرمکھوں، لاکھوں لاکھ عام باشندوں اور باغی فوجیوں کو بے چین کئے ہوئے تھی۔ غیر ملکی غلامی کے خلاف فیصلہ کن جنگ کے لئے سامنت یعنی راجہ نواب تو کمپنی کے کھیل اور اس کی سازشوں سے اچھی طرح باخبر تھے پھر عوام اور فوجیوں میں بھی یہ بات گھر کر گئی تھی کہ ان کی بدحالی کی وجہ بھی کمپنی ہی ہے۔ مذہب ملک اور بادشاہ کے تئیں بھی ان کے احساسات میں اچانک بیداری آگئی تھی۔ دلتوں کے کچھ طبقات کی فکر اس سے ذرا مختلف تھی ۔

نوابین کے سابق دارالسلطنت فیض آباد کے ایک عام کنبہ کی خوبصورت نازنین محمدی جس کا ابتدائی نام تھا ”امّن اور اماوتی“ کے معرفت واجد علی شاہ کے بدنام پری خانہ ۱۸۴۲ء کی زینت بنی۔ مہک پری کے خطاب سے نوازی گئی۔ موسیقی اور رقص میں ماہر (پری خانہ کی تعلیم کی حد تک) نواب صاحب کے نکاح میں آکر بیگم بنی۔ حضرت محل نے اپنے فرزند کی تاج پوشی کے لئے کیکئی کی طرح کوئی سازش نہیں رچی تھی اور نہ تریا چلتر کے تحت کوئی اڑیل رویہ اپنایا تھا۔ ولادت کے موقع پر گیارہ توپوں کی سلامی سے اعزاز بخشنے اور ایک بڑے جشن کی وجہ بننے والا فرزند بڑا ہو کر سیکڑوں توپوں کی سلامی کا فخر حاصل کرے۔ ان کی کسی ایسی خواہش یا آرزو کا اشارہ اودھ کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ پری خانہ میں پریوں کی طرح انھیں بھی رقص وموسیقی کی تربیت دی گئی۔ اتنا ضرور ہے کہ کچھ خاص وجوہات کی بنا پر سیکڑوں بیگموں محلوں کے بیچ انھیں

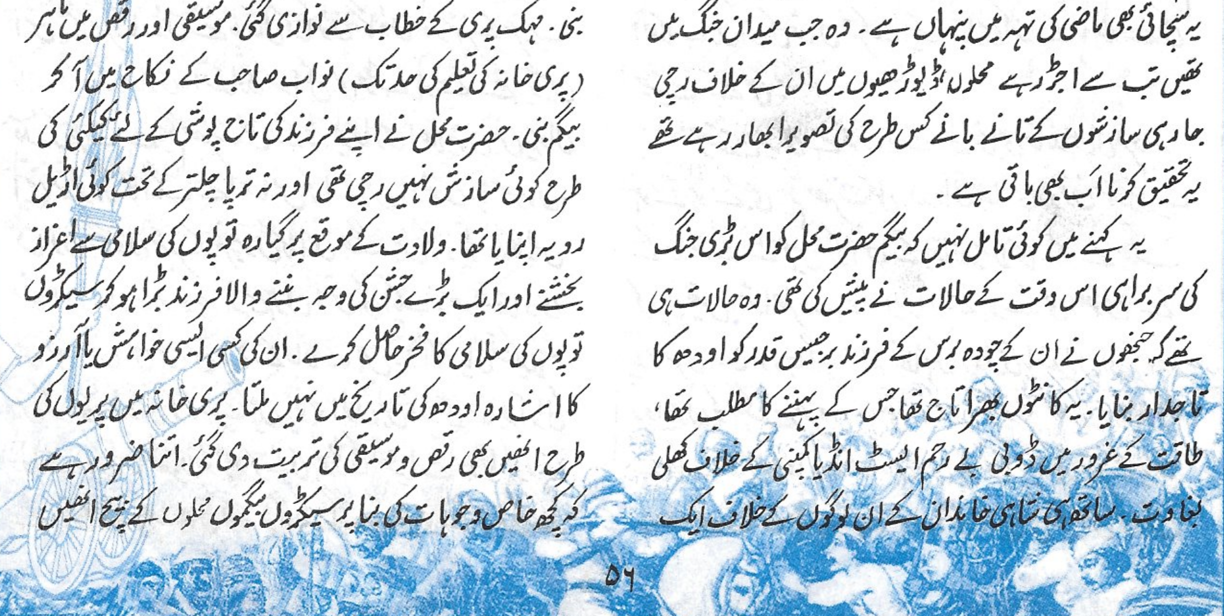

افضلیت ضرور حاصل تھی۔ نواب ان کی جسمانی کشش شگفتگی اور طور طریقے کے تئیں بہت زیادہ متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری بیگموں کا ان سے حسد کا جذبہ رکھنا اور انھیں ہمیشہ زیر کرنے کی کوشش کرنا فطری تھا۔ کچھ بیگموں نے ان کی کھلے طور پر بے عزت کرنے اور ان کی پٹائی کرنے کی بھی کوششیں کیں۔ وہ انھیں رسوا کرنے کا کوئی بھی موقع چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب حضرت محل انقلابیوں کی سربراہی کرتے ہوئے انگریزی اور دلال راجاؤں کی فوج سے زبردست جنگ میں مشغول تھیں۔ نواب واجد علی شاہ نے اپنی ولی عہدی کے دنوں میں اپنے معاشقوں پر مختصر مثنوی افسانہ عشق میں جو بعد میں ’پری خانہ‘ کے نام سے اردو اور ہندی میں شائع کی گئیں، میں ذکر کیا ہے کہ ”سوزاک جیسے مہلک مرض کے وقت جب دوسری بیگموں نے ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی جب بعض دوسرے مواقع پر جب بیگموں کی بے وفائی کے صدمے سے وہ تنہا رہ گئے تھے تو واحد بیگم حضرت محل ہی ان کے ہمراہ تھیں۔ ایک موقع پر جب بیگموں کی منمانی سے تنگ آکر نواب نے تمام بیگموں کو رضی الدولہ کی کوٹھی سے جہاں وہ ان دنوں مقیم تھے زبردستی نکلوا دیا اس وقت بھی حضرت محل کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔ نواب کی اسی خلوت کو برباد کرنے کے مقصد سے دوسری بیگمات نے بغاوت کردی۔ حالات گالی گلوج جوتم بیزار تک جا پہونچے۔ بالآخر ہزاروں کوششوں کے بعد جناب والدہ صاحبہ درمیان میں پڑیں اور کافی بحث و مباحثہ کے بعد اس بات پر فیصلہ ہوا کہ میں روزانہ سات گھنٹے حضرت محل کے پاس گذاروں گا۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک یہی عمل جاری رہا۔ جناب والدہ صاحبہ کی جانب سے ایک ملازم آتا ہے۔ میں ان کے ہمراہ ان بیگمات کے پاس جاکر ایک گھنٹہ گذار کر واپس آتا ہوں... لیکن حضرت محل صاحبہ کو یہ بھی گوارہ نہیں“۔ (پری خانہ ہندی ترجمہ: شکیل صدیقی)

حالانکہ ایک بار نواب صاحب سے کسی بات پر تکرار ہو جانے پر حضرت محل نے خودکشی کی نیت سے ایک تولہ افیون بھی کھالی تھی ایک خاص دور میں نواب صاحب ان سے بہت چڑھے ہوئے تھے۔ ان سے انھیں بے وفائی کا شکوہ تھا۔ اس واقعہ کا ان پر بہت اثر پڑا۔ یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ انھوں نے ان بیگم کے لئے جو تخلص والقابات منتخب کئے گئے ان میں احترام کا جذبہ تو ہے ہی گہری معنویت بھی ہے۔ یعنی مہک پری، افتخار النساء اور حضرت محل بنانے کی ضرورت نہیں کہ حضرت، لفظ اسلام میں عقیدت رکھنے والوں کے لئے جس کے معنی میں پاک و پاکیزہ ہے اتنا ہی محترم بھی۔ واجد علی شاہ نے لکھنؤ میں حضرت باغ (گنج) نام اس جگہ رکھا، جہاں ان کے پدر بزرگوار دفن ہیں۔

بیگم اور نواب کے درمیان اس یگانگت سے لبریز رومانی شوخی کے باوجود ولی عہد یعنی پہلے فرزند کی ذہنی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے بڑے بیٹے کیوان قدر نامزد کئے گئے۔ ان کی ولادت خاص محل کے بطن سے ہوئی تھی۔ برجیس قدر نواب کے چوتھے فرزند تھے۔

وہ جو چوتھا شہزادہ ہے رشک قدر
اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر
وہ چودہ برس کا ہے کچھ شک نہیں
کہوں کیا کہ وہ ہے کہیں کا کہیں
ملاؤں جو حضرت سے لفظ محل
تو نام اس کی ماں کا کھلے بر محل
جو بگڑی تھی آگے سے انگریز فوج
اسے لے گئی جیسے دریا کی موج

(مثنوی حزن اختر)

غدر کے اولین قائدین، سربراہوں کے درمیان بھی ایسی کوئی وسیع طور پر رضامندی نہیں تھی کہ برجیس قدر کو ہی بادشاہ بنایا جائے قانون کے مطابق، شاہی روایت کے مطابق بادشاہی کا وقار و اعزاز ولی عہد (اعلان کے مطابق جانشین) مرزا کیوان قدر کو ملنا چاہئے تھا لیکن وہ ان دنوں دادی اور چچا کے ساتھ لندن میں تھے۔ اقتدار غصب کئے جانے کے خلاف ملکہ وکٹوریہ کے حضور میں اپیل کرنے کی غرض سے نواب صاحب نے ان لوگوں کو لندن بھیجا تھا۔ کلکتہ میں علالت کی وجہ سے وہ خود نہیں جاسکے تھے۔ تیسرے فرزند فریدوں قدر والد کے ہمراہ کلکتہ مٹیا برج (موچی کھولا) میں تھے۔

کروں اب تیسرے پسر کا بیاں
وہ ہے شاہزادہ مرے ساتھ یاں
فریدوں سے گر ضم کرو لفظ قدر
تو ہو نام اس کا عیاں رشک قدر

یہ ہے موچی کھولے میں اب بھی مقیم   میری قید سے ہے وہ رنج عظیم
(مثنوی حزن اختر)

نہ کوئی بیگم اپنے فرزند کے لئے اور نہ کوئی شہزادہ اپنی دعویداری میں سامنے آیا یہاں تک کہ جن شہزادوں کے سامنے تاجدار بننے کی تجویز رکھی گئی ہے انھوں نے بھی اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا یہ تاریخ کے نایاب لمحے تھے۔ کبھی بہت ساری خوبیوں کے لئے مشہور اودھ کی شان و شوکت والی سلطنت کا بیش قیمتی تاج جیسے اپنی مکمل کشش کھو چکا تھا۔ مشکلات، جوکھم، چیلنج اور صرف کانٹے تھے وہاں۔ نوآبادیاتی مخالف جنگ کی تاریخ میں بیگم حضرت محل کا اہم کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے ناسازگار حالات میں بھی بڑے پرعزم طریقے سے اپنے نابالغ فرزند کے لئے اودھ کے کانٹوں بھرے تاج کو پہنانے کی منظوری دے دی۔ حضرت محل نے اپنے فیصلے پر دوسری بیگمات کی منظوری چاہی تو طنز آمیز جملے مخالفت اور نامنظوری کی ایک گھنی باڑھ انھیں اپنے سامنے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ کئی بیگموں نے تو نواب صاحب کو شکایتی خط بھی تحریر کر دئے۔

> “حضرت محل آپ کی محبوبہ، سرکار سے جوڑ توڑ کر کے باغیوں کی سردار بنی ہے۔ نواب محمد علی کے بہکاوے میں آگئی ہے شورا پشتی دکھا رہی ہے دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھے.....” (شیدا بیگم)

یہ شکایت ان نواب صاحب سے ہو رہی تھی جنھیں انگریزوں سے لڑنا پسند نہیں تھا جو باغی سپاہیوں کو مرزا غالب کی طرح فسادی سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے۔

جو بگڑی تھی آگے سے انگریزی فوج   اسے لے گئی جیسے دریا کی موج
وہ مہ قبضۂ مفسداں میں ہے آہ   بنایا ہے اپنا اسے بادشاہ

ان جیسے جاگیرداروں کی ہی سجاد ظہیر نے روشنائی میں جدوجہد کی اخلاقیات کھو چکے حکمران کے روپ میں نشاندہی کی ہے۔

لکھنؤ سے کلکتہ کوچ کرتے ہوئے جن نواب صاحب نے اودھ کے عوام کو پیغام دیا تھا کہ۔ “انگریزوں کا حکم ماننا، مال گذاری ادا کرنا، وفادار بن کر رہنا، کسی بھی حالت میں بغاوت نہ کرنا”۔ (سن ۵۷ء کی ریاستی بغاوت اور مارکسواد ص ۳۲۴ رام بلاس شرما)

انھیں نواب صاحب کی بیگم بغاوت کی آگ کو دہکا دینے کے لئے تیار تھیں۔ وہ بھی اس حد تک کہ کارل مارکس کو لکھنا پڑا کہ لکھنؤ میں ایک ایک اینچ زمین کے لئے انگریزی فوج کو سخت جد و جہد کرنی پڑ رہی ہے جبکہ بعض مورخین، بغاوت کی تفصیل رقم کرنے والوں نے بیگم کی جنگ کو اونچی اٹھان دینے والے اس تاریخی فیصلہ کے پیچھے ان کی ڈیوڑھی کے داروغہ ممّو خاں کی سرگرمیوں کی نشاندہی خصوصیت کے ساتھ کی ہے لیکن سابق شہر کوتوال علی رضا بیگ نے اپنے بیان میں اس سلسلہ میں راجہ جیالال کا بھی نام لیا ہے انقلاب کے وہ خاص رکن تھے۔ انگریزوں کے خلاف چل رہی زبردست جنگ کے مشکل اور نازک اوقات میں بھی ممو خاں بیگم حضرت محل کے ہمراہ رہے یہاں تک کہ ان کے ساتھ نیپال تک گئے۔

پھر بھی اقتدار اعلیٰ و اختیار بیگم کے پاس ہی تھا۔ سرکاری رپورٹ میں انھیں ذہین، لائق اور چاق و چوبند خاتون کہا گیا بغاوت کی ایک چشم دید تفصیل کے مطابق:

> “الغرض سب طرح لوٹ ہی لوٹ تھی۔ معاذ اللہ توبہ بھلی۔ پھر جمعہ کی شام کو افسرانِ فوج (انقلابی) مرزا علی رضا بیگ کوتوال قدیم شہر کو باجبر بلوا کر کوتوال کیا اور حکم بندوبست کا دیا۔ انھوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے جا بجا تھانہ بٹھائے مگر اوباشان اور تلنگان پر قہر کہ کسی طرح باز نہ آتے تھے۔ مرغی والے ہوا پر تھے پھر ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ (۵ جولائی ۱۸۵۷ء) چار گھڑی دن رہے افسران سپاہ بے پناہ نے مشاورت شاہ جی (احمد اللہ شاہ) صاحب یود کمال کے کوٹ کیا یعنی کمیٹی کا قلعہ باندھ کر مرزا برجیس قدر بہادر شہزادہ نابالغ حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ کے خلف در نجف جو بطن نواب حضرت بیگم صاحبہ سے تھے

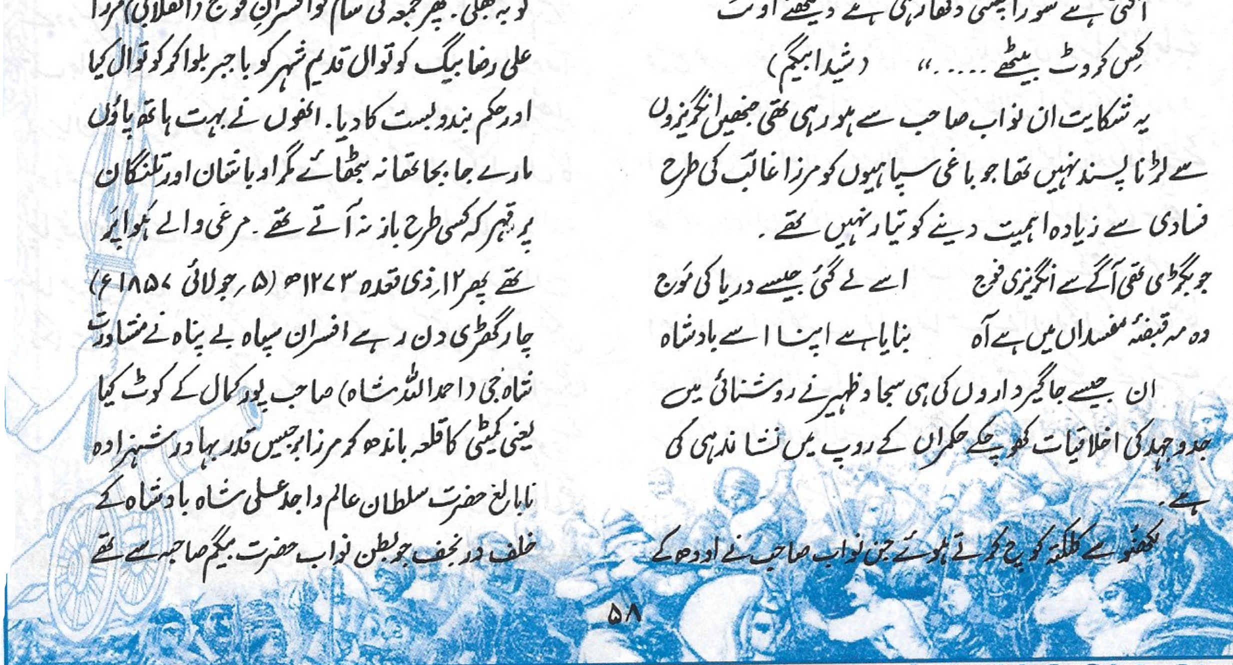

ریاست کی گدی پر لا بٹھایا۔ گیارہ برس کے سن میں بڑا رئیس بنایا، ”جناب اعلا لقب“ ہوا۔ گویا نگینہ لعل و خاتم ریاست پر نصب ہوا۔ کل افسران سپاہ بے پناہ نے نذریں دیں اور شاہ صاحب نے خیر سے دعا خیر گود بھری۔ تلنگے سوار غارتگر باندازوں نے سلامیاں لیں اور توپیں تہنیت کی چلنے لگیں۔ بیگم صاحبہ کو سب نے جناب عالیہ کہا حق بہ مرکز قرار پایا۔ بیگم صاحبہ اُپنے۔ ان کے مان دان میں لگیں اور امیدیں امن و امان کی جانی۔ تمام اہل شہر کو شادی ہوئی کہ ایک صورت حاکمی اور آبادی کی نکلی۔ نوبت بجی، شادی پڑی۔ ارکان دولت مہاراج بال کشن دبیر الدولہ، مفتاح الدولہ غلام رضا خاں شرف الدولہ وغیرہ خواہ مخواہ جمع کئے گئے۔ منشی امیر احمد امیٹھوی، مرزا آغا نجف کشمیری داروغہ میر واجد علی کارکن ہوئے۔ ان سب سے اونچے بیگم صاحبہ کے اوپری داروغہ ڈیوڑھی کہ جن کی یہ ساری کارستانی تھی“

(مرقع خسروی ص ۵۰۴)

اس تفصیل سے یہ تو واضح ہو جاتا ہے کہ جنگ کا حال بیان کرنے والے برجیس قدر کو بادشاہ بنانے کے پیچھے مموخاں کی فعالیت کی نشاندہی کرنا نہیں بھولتے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ برجیس قدر کے بادشاہ بننے سے بعض بیگموں درباریوں اور خاص لواحقین کو چھوڑ کر اودھ کے عوام عام طور پر خوش تھے۔ بعض دوسرے مشاہدین نے بھی اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور یہ کہ باغی فوجی کسی کے قبضہ میں نہیں تھے وہ اپنی من مانی کر رہے تھے۔ اس عدم ضابطہ اور خودروی کو روکنے کے لئے ہی کسی کو بادشاہ بنانا ضروری سمجھا گیا جبکہ گہرے ذہنی اضطراب اور خوف سے پُر یہ مظلوم عوام ہی اس بغاوت کے اہم اور بنیادی جزو تھے۔ مولوی احمد اللہ شاہ جو غالباً اس بڑی جنگ کے سب سے زیادہ جری، دلیر، بے باک اور پرعزم ہیرو تھے۔ برجیس قدر کی تخت نشینی کے لئے اُن کی رائے ضروری مانی گئی۔ حالانکہ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد ہی بیگم اور مولوی صاحب میں اتنی گہری نظریاتی نا اتفاقی ہو گئی کہ دونوں کی جنگی پالیسیاں الگ الگ بننے لگیں۔ تلواروں کا مقابلہ بھی ہوا۔

اس تفصیل میں کمیٹی کا قلعہ باندھنے کی طرف جو اشارہ ہے رام بلاس شرما نے اسے فوجی کمیٹی کا فیصلہ بتایا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ لکھنؤ کی جنگی کمیٹی دہلی کی فوجی کمیٹی کے ماتحت کام کر رہی تھی۔ (مرقع خسروی ص ۴۶۱) یہی وجہ ہے کہ ایک طرف جہاں بیگم حضرت محل نے واجد علی شاہ کے تاحیات رہنے تک برجیس قدر کو بادشاہ نہ کہے جانے کا اصرار کیا۔ وہیں فوجی کمیٹی نے ان سے دہلی کے تخت شاہی کے نائب کی حیثیت سے کام کرنے کو کہا اور یہ بھی شرط عائد کر دی گئی کہ نہ بادشاہ اور نہ ہی بیگم بغیر فوجی کمیٹی کی رضامندی کے کوئی فیصلہ کریں گی۔ بیگم کی رضامندی سے انھیں بہادر شاہ ظفر سے سند لینے کے مقصد سے دہلی بھیجا گیا مگر وہ ارادوں سے مضبوط جنگ کی سربراہی کر رہے ضعیف بادشاہ نے برجیس قدر کو (رمضان المبارک میں ولادت ہونے کے باعث ان کا مکمل نام رمضان علی خاں تھا) سند بھی دے دی گئی اور سفیر الدولہ کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ برجیس قدر تو دادا کا دیا گیا خطاب ہے۔

انگریزوں نے اودھ کے نواب کو آزاد بادشاہ بنایا تھا ہندوستانی فوج نے اسے پھر بادشاہ کا نائب بنا دیا۔ برجیس قدر کو تخت پر بٹھانے سے قبل فوج نے شرط رکھی کہ دہلی سے جو بھی حکم صادر ہو گا اسے قبول کرنا ہو گا۔ لکھنؤ میں فوجی کمیٹی کی تشکیل دی جا چکی تھی۔ دہلی کی کمیٹی سے اس کا تعلق تھا۔ وہ دہلی کمیٹی کے ماتحت تھی اس لئے اس نے دہلی کا حکم ماننے کی شرط رکھی تھی“

(رام بلاس شرما سن ستاون کا انقلاب اور مارکس واد ص ۴۶۵)

بیگم حضرت محل نے اس ماحول کو برجیس قدر کے وسیلے سے جنگ کی قیادت کرنے کی منظوری دے کر اگر ایک طرف اس ضروری بغاوت کو منتشر ہونے سے بچایا۔ اسے تنگ نظری کے بجائے عظیم ترین واسطوں سے ہمکنار کیا۔ رام بلاس شرما کے مطابق اسے قومی بیداری دی اسے جمہوری طرز نظامت کی اخلاقیات عطا کی

سبھی کے لئے ایک جیسے قومی مقصد کی حمایت کی تو اسے عظیم الشان شکل دینے میں بھی مدد کی۔ واضح ہے کہ اس سے جنگ کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور اس کی رگوں میں نیا خون رواں ہوا نئے ولولے اور جوش کی تیز لہر دور تک پھیلتی گئی۔ ناانصافی سے غصب کئے گئے اقتدار کو اس کے وارث کو سونپنے کی عوامی حمایت کی مانگ کے ان کے پاس مضبوط دلائل تھے۔ باوجود اس کے باغی فوجیوں کے ذریعہ بادشاہی انتخاب کے جمہوری نظام میں انھوں نے کوئی ضرر نہیں پہونچایا اس لئے نگینے (چاندی) والی بارہ دری لکھنؤ میں برجیس قدر کو اودھ کا تاجدار (جولائی ۱۸۵۷ء) بنا کر اقتدار کی دوبارہ بحالی کا اعلان بلاشبہ قانونی و اخلاقی سیاق و سباق میں تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کی خفیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ۔

> «ہمیں اقرار کرنا چاہئے کہ ان حالات میں جو جنگ اودھ میں چلائی گئی اس کی شکل بغاوت کی نسبت جائزہ جنگ کی زیادہ ہے۔»

(رام بلاس شرما سن ستاون۔ ص ۴۲۳)

کارل مارکس نے بھی اسی عہد میں لکھے گئے اپنے مضمون میں اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کر کے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس نے بھی اپنی خفیہ رپورٹ میں تحریر کیا ہے کہ اودھ کا اقتدار غصب کئے جانے کی کوئی جائز بنیاد نہیں ہے برٹش شہنشاہیت کی بدنما ولایت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ شرمناک سپردگی کی قرارداد کے معاہدے پر دستخط نہ کر کے (فروری ۱۸۵۶ء) واجد علی شاہ نے ایک طرح سے آنے والے دنوں میں نوآبادیاتی غلامی کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والوں کو اخلاقی قوت عطا کی تھی۔ یہ بات دیگر ہے کہ اس کا سہرا خصوصی طور پر ان کے لواحقین کے سر جاتا ہے۔

جفا کش کا شاہ اودھ نام ہے
حکومت کا آخر یہ انجام ہے
جو وہ لاٹ ڈلہوزی اسوقت تھے
مضامین انھوں نے یہ خط میں لکھے

رعایا بہت تم سے ناراض ہے
تمہاری ریاست ہے بدنام شے
رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ
فقط نام کے تم رہو بادشاہ
مہینہ ہر ایک ماہ ایک لاکھ کا
ملے گا تمہیں کچھ نہیں شک ذرا
ریزیڈنٹ جنرل اوٹرم جو تھے
گورنر کا خط وہ مجھ کو دے گئے
ہوا گھر میں کہرام سن کر یہ بات
وہ دن دوپہر ہو گئی ساری رات
وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج
کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج
جہاں جز اطاعت نہ تھا دل میں شر
نہ تھی ایسے دن کی تو ہرگز خبر
یہ بندہ بہت ان دنوں تھا علیل
کہا دل نے کیا سوچوں اکی سبیل
علی نقی خاں میرے تھے وزیر
وہی میرے ہر حال میں تھے مشیر
مرے دل میں آتا تھا ہر دم خیال
جو ہونا تھا وہ ہو چکا کیا ملال
کرو مہر تم راضی نامہ پہ اب
گئی سلطنت تو گئی ہے سبب
مگر سارے گھر نے نہ چھوڑا مجھے
دبایا ڈرایا جھنجھوڑا مجھے
رعایا یہ سب کہتی تھی واہ واہ
کیا ہم کو اس بادشاہ نے تباہ
یہ جائے جو فریاد کو خوب ہے
یہ ناحق جو راضی ہو معیوب ہے

(مثنوی حزن اختر۔ واجد علی شاہ)

برجیس قدر کی طرف سے بیگم حضرت محل کا یہ اعلان بھی وقت کے چہرے پر چھائے دھندلکے کو صاف کرتا ہے۔

> «خلق خدا کی ملک بادشاہ دہلی کا حکم مرزا برجیس قدر بہادر کا۔ ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس پاک پروردگار نے جو ہم سب کا خالق ہے اس نے ہماری حکومت لوٹا دی ہے۔۔۔ اب جبکہ حکومت کا نظام ہمارے ہاتھ میں ہے حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص فساد یا لوٹ نہیں کرے گا۔۔۔ خلاف ورزی کرنے والے حاکم شرع کی رو سے سزا کے مستحق ہوں گے۔۔۔»

اس بیان کے ساتھ ہی انھوں نے اودھ کی سلطنت سے انگریزوں کو باہر نکالنے کا عزم بھی کیا اور سبھی لوگوں سے دوسرے کام میں ساتھ دینے کی اپیل کی۔ یہ ایک طرح سے برٹش کے سامراج واد کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس روشنی میں غور کریں تو بیگم حضرت محل سے صلح معاہدہ کے لئے جنرل اوٹرم کی

تجویز زیادہ معنی خیز ہو جاتی ہے جنگ سے دستبردار ہونے اور انقلاب کو کچلنے میں مدد دینے کی شرط پر وہ انھیں اودھ کی سلطنت واپس کرنے کو تیار تھا یہاں تک کہ اپنی پہلی تجویز میں انھوں نے نواب شجاع الدولہ کے عہد کا پورا علاقہ بیگم کو دینے کی پیش کش کی تھی بعد میں واجد علی شاہ کے دور کا علاقہ جنگ کی ناکامی، مددگاروں کی بے وفائی، لکھنؤ کو خیرآباد کہنے (مارچ ۱۸۵۸) پر مجبور ہوئے اور بونڈی میں ہر عزم عہد کا اظہار اور نیپال میں پناہ لینے کے بعد یہ تجویز الگ الگ انداز میں انھیں پیش کی جاتی رہیں۔ ایک تجویز تو اس انگریز فوٹو گرافر کے ذریعہ پیش کی گئی جو شہزادہ برجیس قدر کی فوٹو کھینچنے نیپال گیا تھا۔ بیگم پر جوش انداز میں اس طرح کی تجاویز ٹھکراتی رہیں پہلے تو کامیابی کی پر یقین خوابیدہ نشہ میں پھر دغا و فریب کے شبہ میں یا پھر اس وجہ سے بھی کہ وہ یہ محسوس کر رہی تھیں کہ یہ جنگ واحد ان کی یا ان کی ریاست کی نہیں بلکہ پورے اودھ کی ہے۔ انگریزوں کی کسی بھی تجویز پر صلح کرنے سے پہلے جگہ جگہ انگریزی فوجوں سے مقابلہ کرنے والے جانباز سپاہیوں میں ناامیدی اور بے چینی گھر کر جائے گی۔ ان کا حوصلہ پست ہو جائے گا اور نیپال میں پناہ لینے کے دوران اس وجہ سے کہ جس خطہ میں کبھی ان کے شوہر نامدار کا اکیلا اقتدار تھا وہاں نئے حکام (جو غیر ملکی اور لٹیرے بھی تھے) کی نگرانی میں ٹھاٹھ سے رہنا انھیں قطعی منظور نہیں تھا ملکہ وکٹوریہ کے نمائندوں نے لکھنؤ یا فیض آباد کہیں بھی آرام سے رہنے کی تجویز پیش کی تھی۔ بعض تکنیکی وجوہات کے علاوہ بیگم حضرت محل اور پھر برجیس قدر کے لئے اودھ کے عوام کی بھرپور حمایت بھی کم اہمیت نہیں رکھتی۔

۵ ر جولائی ۱۸۵۷ کو تخت نشینی کے جشن کے دوران ہزاروں افراد کا چاندی والی بارہ دری کے نزدیک جمع ہونا۔ سیکڑوں افراد کا بارہ دری کے اندر داخل ہو جانا پھر نئے بادشاہ کا نیاز حاصل کرنے کا اصرار کرنا۔ اودھ کے مختلف راجاؤں کے ذریعہ بادشاہ کی حمایت میں یکجا ہونا اور انگریز مخالف جنگ میں ہر طرح کی مدد کے لئے رضامندی ظاہر کرنا بھی جائز وارثت کی حیثیت ان کی منظوری کے جذبہ کی عکاسی کرتا ہے حقیقت کی تہ کو کریدا جائے تو اس بات / راز کا انکشاف ہوتا ہے کہ بیگم نے خود یا اپنے فرزند کے سکون کے لئے اس عظیم جنگ اور ان پر اعتماد و بھروسہ کرنے والی اودھ کی رعایا کے ساتھ ایک لمحہ بھی دغابازی نہیں کی۔ انقلاب کے لئے ان سے اسی جذبۂ وابستگی اور عزم وارادوں کی پختگی نے ہی پورے اودھ میں ایسا جوش و ولولہ نیز بیداری پیدا کر دی کہ لاکھوں لاکھ افراد ان کے ایک اشارے پر قربان ہو جانے پر تیار ہو گئے۔

"اودھ کے چھ ضلعوں میں غدر سے متعلق ______ حقائق اور (غیر مصدقہ روایتی کہاوتیں) یکجا کرتے ہوئے میرے پاس اب اتنا مواد ضرور ہو گیا ہے کہ اس پر طائرانہ نظر ڈالتے ہی ۱۸۵۷ء کا خاکہ از خود واضح ہو جاتا ہے۔ بارہ بنکی میں مہادیوا یا حضرت پور میں رجواڑوں کی میٹنگ میں بیگم حضرت محل کی جوشیلی تقریر کرنا ایک انقلابی ادارے کے منظم ہونے کا اشارہ کرتا ہی بیگم حضرت محل بلاشبہ بڑے عزم و حوصلہ کی خاتون معلوم پڑتی ہیں مہادیوا میں اپنی موثر تقریر سے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنا اور اس کے نتیجہ میں ہزاروں ہندو مسلمانوں کا تلواریں اٹھا کر ملک کے لئے اپنی جان قربان کر دینے کی قسمیں کھانا دل میں واقعی پر کیف منظر پیش کرتا ہے۔"

(غدر کے پھول۔ امرت لال ناگر: ص ۱۴۲)

سر ولیم رسل کے اس نظریہ کے باوجود کہ "اپنے بیٹے کی بھلائی اور بقا کے لئے انھوں نے سارے اودھ کو مشتعل کر دیا ہے اور اہم افراد نے اس (بیٹے) کے لئے وفادار رہنے کی قسمیں کھائی ہیں۔ اودھ کی رعایا میں بڑے پیمانے پر یہ یقین مستحکم ہوتا گیا کہ بیگم پوری ریاست کی آبادی اور بقا کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں کیونکہ ولیم رسل نے بعد میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ بیگم اپنے شوہر سے زیادہ مرد ہیں"۔

بیگم نے فن سپہ گری جنگی مہارت، انقلاب کے لئے فکری استحکام، زاویہ نظر میں نرمی، بے خوفی اور واضح مقصد کے باعث

یہ یقین نہ صرف ان کی بلکہ مکمل انقلاب کی بیش بہا پونجی اور قوت ثابت ہوئی۔ خواتین اور بچوں کو قتل نہ کرنے کے حکم سے اس پر تشدّد جنگ میں ان کے حساس دل ہونے کا بھی ایک پہلو ظاہر ہوا ہندو رجواڑوں اور رعایا کی بڑی تعداد میں شمولیت کا بڑے پیمانے پر حمایت حاصل کرنا جن میں دلت بھی شامل تھے اور بیگم کی اپیل پر ان کا ساتھ دینے کے جوش و حوصلہ سبھی حقوق کے درمیان اتحاد قائم رکھنا حقیقت میں ان کی بہت بڑی کامیابی تھی اس سے ایک طرف جہاں انگریز مخالف جنگ کو زیادہ دن تک چلائے رکھ پانا ممکن ہوا وہیں بیگم کو خود اپنی اور اپنے لڑکے کی جان کی حفاظت کے لئے انقلابیوں کو سزا دینے میں بے رحمی کی سبھی حدیں توڑ دینے والے گوروں کے آگے گڑگڑانا نہیں پڑا جیسا کہ بہادر شاہ ظفر کو کرنا پڑا تھا۔ بیگم اپنے فرزند و بہی خواہوں کے ہمراہ حفاظت کے ساتھ نیپال پہونچ سکیں۔ یہ عمل عوام اور رجواڑوں کے تعاون سے ہی ممکن ہو سکا۔ کہنے کو تو بیگم کا ساتھ دینے یا انقلاب کا شریک کار بننے والے اکثر راجہ اہم طور پر وہی تھے جن کے ساتھ انگریزوں نے کبھی مظالم کئے تھے۔ ان کی جاگیریں غصب کی تھیں یا ان کے حقوق میں کمی کی تھی یا کسی سبب ان کے دل میں گوروں کے تئیں گہری بے زاری تھی اور انتقام کا تلخ جذبہ بھی تھا۔ بے شک اس حقیقت میں دم ہے لیکن یہ حالات کا نصف سچ ہے۔ یقیناً ایسے راجہ انگریزوں سے حساب چکتا کرنے کی ٹھانے بیٹھے تھے لیکن بیگم کا ساتھ دینے کو انھوں نے جس عقیدت مندی سے دھرم کے نام اور دھرتی کی پکار سے جوڑا وہ مروج حقیقت کا ایک دوسرا پہلو بھی سامنے لاتا ہے بیگم کے لیے جناب عالیہ یا راج ماتا کا (राज माता) دو لفظوں کا مرکب ہی نہیں ہے۔ غور کرنا چاہئے کہ وہ روایت سے شاہی خاندان کی فرد نہیں تھیں۔ نواب صاحب کی شوخی طبیعت کے باعث وہ اس شاہی خاندان میں داخل ہو سکی تھیں۔ شنکر پور کے رانا بینی مادھو واجد علی شاہ کے وقت ہی کافی اثردار اور بڑے علاقہ کے مالک تھے۔ انگریزوں نے نواب صاحب کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے ساتھ ہی رانا کے کچھ علاقے بھی ضبط کر لئے۔ رانا کا ناراض ہونا فطری تھا۔ برجیس قدر کی تاجپوشی کے جشن میں وہ بھی موجود تھے وہ پوری طاقت اور وسائل سے بیگم کے ساتھ تھے۔ نوآبادیاتی مخالف اس جنگ کو اودھ کے ایک بڑے علاقہ میں روایتی لڑائی کی بڑی شکل دینے میں رانا بینی مادھو کی خصوصی اہمیت ہے لیکن وہ بیگم کا ساتھ کس بنیاد پر دے رہے تھے ” دھرم کے بدلے لڑب بیگم اور برجیس کدر کا ساتھ نہ چھوڑ بیٹھے“

(غدر کے پھول)

انگریز انھیں بیگم کا ساتھ ترک کرنے کی شرط پر ان کا علاقہ واپس کرنے کو تیار تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قوت تھی کہ جس نے انھیں یہ تجویز ٹھکرائے کے لئے متحرک کیا اور مشکل ترین جلا وطنی کی زندگی گذارنے کا عزم دیا۔

اسی طرح راجہ جئے (جیا) لال سنگھ نے جو برجیس قدر کی سرکار میں ممو خاں سے قبل سب سے زیادہ اہم شخص تھے نہ صرف مختلف ہندو بادشاہوں کو بیگم کے ساتھ متحد کرنے میں معاون ہوئے بلکہ فوج، اسلحہ، ساز و سامان اور رقم یکجا کرنے میں بڑی مدد کی۔ انھوں نے ایک خاندانی فرض نبھانے کی مانند یہ جنگ لڑی۔ نانا صاحب کو بیگم کی جانب سے لکھنؤ بلانے کی دعوت انھوں نے ہی دی جیسا کہ منشی واجد علی نے بیان دیا۔ (۲۹ جون ۱۸۵۹ء) کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ”راجہ جے لال، رگھو دیال اور نصرت جنگ، ان کے بھائی فتح پور چوراسی (اناؤ) گئے اور نانا صاحب کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لائے۔ انھیں دولت خانہ (شیش محل) میں ٹھہرایا۔ ان کے لئے قالین، پھل اور دوسری اشیاء اپنے گھر سے بھیجیں۔ نانا صاحب نے راجہ اور ان کے بھائی کو خلعت عطا کی۔ راجہ اور ان کے بھائی رگھو ور دو تین دنوں کے وقفہ پر نانا صاحب کی خیریت دریافت کرنے ضرور جاتے تھے“۔

(فری ڈم اسٹرگل ان یو پی۔ اے، اے رضوی ص ۱۰۱)

یہاں تک کہ راجہ نے دشمنوں کے گھروں سے جو مال اسباب لوٹا وہ بیگم کے خزانے میں جمع کیا یا سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ جبکہ

ممو خاں کے بارے میں رائے ہے کہ انھوں نے لاکھوں روپئے اپنے گھر میں بھر لئے۔ جنگ میں راجہ کی زبردست دلچسپی اور سرگرمی نے انھیں پھانسی کے پھندے (یکم اکتوبر ۱۸۸۹ء حضرت گنج لکھنؤ) تک پہونچایا۔

بادشاہ کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے رعایا کی بہبود اور ترقی کے لئے بہت کم کام کئے۔ انگریزوں کے خلاف ان کا لڑنا جرم نہیں تھا بلکہ جو راجہ نہیں لڑے دراصل مجرم تو وہ ہیں۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی فریب دینے والی پالیسی اور گورے افسران کے ذریعہ کی گئی ناانصافی کے خلاف اگر راجہ اسے بڑی شکل دے سکے تو اس میں برا کیا ہے۔ تاریخ کا یہ عجب واقعہ ہے کہ مظلوم عوام ہی راجہ پر انگریزوں کے خلاف لڑائی چھیڑنے کا دباؤ بنا رہے تھے۔ رام بلاس شرما نے صحیح لکھا ہے کہ اس لڑائی میں تعلقداروں اور زمینداروں نے عوام کا ساتھ دیا اور یہ کہ سن ستاون کی جنگ میں اودھ کے راجاؤں نے اپنے وجود کا ثبوت ایسے حقیقت پسندانہ انداز میں دیا کہ انگریزوں کے لئے اس سے انکار کر پانا ناممکن ہو گیا۔ غیر ملکی حکومت کے دیسی فوجی کچھ عرصہ انگریز پسند راجاؤں کے خلاف بغاوت کرنے والے ہندوستانی سپاہی اس انقلاب کی اہم قوت اور کرتا دھرتا تھے۔ اس حقیقت سے بھی انکار کر پانا ممکن نہیں۔ بیگم حضرت محل کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک تو انھوں نے اودھ میں انقلاب کی باقاعدہ ماہرانہ قیادت کی اور دوسری طرف ضعیف بہادر شاہ ظفر کی سربراہی میں دہلی کی کمر خم نہ ہو جائے اس کے لئے انھوں نے فوج، اسلحہ، رقم سبھی طرح سے دہلی کی فوجی کمیٹی کی مدد کی۔ ریاست اودھ کے باہر جہاں جہاں نوآبادیات مخالف جنگ چل رہی تھی ان کے سربراہوں سے رابطہ قائم کیا۔ دہلی کی شکست کے باوجود اپنی فعالیت سے جس میں یقیناً ہی دوسرے بہت سے لوگوں کا تعاون شامل ہے اودھ میں جگہ جگہ جدوجہد کرنے والے افراد نیز ٹکڑیوں میں ناامیدی کا جذبہ بیدار ہونے سے روکا۔ اس امر سے عوام اور ملک کے مختلف حصوں میں یہ پیغام گیا کہ اودھ کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بیگم کا ہاتھی پر سوار ہو کر عالم باغ (لکھنؤ) اور بعض دوسرے مورچہ پر جانے کا بھی بہت اثر پڑا جس کا تذکرہ شیدا بیگم اور کچھ انگریز افسران نے بھی اپنے خط یا تفصیل میں کیا ہے۔ راجہ کو بھگوان کا نمائندہ تسلیم کرنے اور معجزوں میں یقین کرنے والی عوام کو بیگم کی شخصیت میں معجزات کے درشن ہوں تو تعجب کی کیا بات ہے بھلا ایسا کام پہلے کب کسی خاتون نے کیا تھا۔ رانا بینی مادھو کی بھی ایک بڑے علاقہ میں تقریباً یہی حالت تھی۔ ایسی شہادتیں ہیں کہ عوامی کہاوتوں کے روپ میں بیگم کی شہرت دور تک پھیل گئی تھی خود کو انگریزوں کی گرفت سے بچائے رکھنے میں بھی انھوں نے یہی پیغام دیا۔ سچ بولئے تو انھوں نے خود کو ذلت سے بچا کر اودھ کو ذلیل ہونے سے بچایا تھا۔ اودھ کو فخر یہ بھی ہے کہ جس ہڈسن نے بہادر شاہ کی گرفتاری کے بعد ان کے شہزادوں کو ان کے لباس اتار کر کثیر مجمع کے سامنے دہلی گیٹ پر گولی مار کر جسم سے سر کو الگ کیا تھا اسی ہڈسن کو ۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ کے حضرت گنج میں بیگم کے جانباز سپاہیوں نے دھول چٹا دی۔ بیگم نے اس کو شہزادوں کا قاتل قرار دیتے ہوئے سزائے موت دینے کا اعلان کیا تھا۔ فوجیوں اور دوسرے عہدہ داروں کی تنخواہ میں پسندیدہ اضافہ کر کے بھی، بھلے جس کا مزہ وہ زیادہ دن تک نہیں لے سکے انھوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ انگریزی حکومت کے ہندوستانی ملازمین سے ملازمت چھوڑ کر برجیس قدر کی ملازمت میں شامل ہونے کی اپیل کا کافی اثر ہوا۔ نتیجے کے طور پر بڑی تعداد میں لوگ انگریزی ملازمت چھوڑ کر ان کی ملازمت میں آئے۔ ان کی جو کامیابی سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے اور جس کی حصولیابی بیش قیمتی مانی جاسکتی ہے وہ ہے اودھ کے مختلف علاقوں میں ان کا دورہ، راجاؤں، تعلقداروں سے ان کا رابطہ اور پردہ میں رہ کر جوشیلی تقریر کرنا۔ دشوار بیہڑ جنگلوں سے جنگ کی قیادت کرنا غور سے دیکھیں تو یہ سب ایک جدید خاتون کی تخلیق کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ قسمت بھی کیسی ستم ظریفی سے بندھی ہوتی ہے مردوں کی بالادستی کے دور میں ایک خاتون جدوجہد کر رہی تھی انصاف

کے لئے عزت نفس خود داری کی حفاظت کے لئے جس میں اقتدار کی واپسی لازم طور پر پنہاں تھی اور جس کا آخری نتیجہ فتح و شکست دونوں حال میں مردوں کی بالادستی اقتدار کی مضبوطی کے روپ میں ہی سامنے آنے والی تھی پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ رانی لچھمی بائی، جھلکاری بائی، بیگم حضرت محل نیز عزیزن بائی وغیرہ نے اور دوسری بہادر خواتین نے پس و پیش میں پھنسی عورتوں کو اپنی لڑائی کے میدان میں اترنے کی ترغیب دی وہیں اس کتبہ کی عبارت کو بھی ممکن بنایا کہ عورت جنگ کر سکتی ہے مردوں کی طرح بلکہ اس سے بھی بہتر۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بیگم حضرت محل کا کردار زیادہ تر خوب لڑی مردانی کی مردوں کی بالادستی والی ذہنیت کو نیست و نابود کرتی ہے۔ ان کی جنگی مہارت میں ان کی عورت ہونے کا بڑا حصہ ہے۔ ہندوستانی نشاۃ الثانیہ میں جس کی اپنی اہمیت ہے خصوصی طور پر اودھ ہندی علاقہ میں جس نے آنے والے دنوں میں بڑی عوامی جنگ کا خاکہ تیار کیا تھا وہ تھا اضافی ذہنی اضطراب کی وسیع تر انتہا پسندی۔ ان کی جدوجہد کا ایک معنوی پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس جنگ کو صرف مسلمانوں یا خاص فرقے کی جنگ ہونے سے بچا لیا۔ علماء اور مولوی احمد اللہ شاہ کے دباؤ کے باوجود جنگ کو جہاد یا فتح اسلامی کی تشکیل دینے سے روکا۔ یہی وجہ تھی کہ مولوی احمد اللہ شاہ سے گہرے اختلاف بھی رہے۔ یہ انھیں کی شان تھی کہ کئی بار انھوں نے مولوی صاحب کے پر تشدد ارادوں پر پابندی لگائی حالانکہ برجیس قدر کی طرف سے مسلمانوں کو جنگ میں شامل کرنے کے مقصد سے جاری کئے گئے بیانوں میں بار بار اسلام کی دہائی دے کر مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی اور ان سے اتحاد بنائے رکھنے کی اپیل کی گئی۔

اودھ کی جنگ کو زیادہ دنوں تک جاری رکھنے سے اس بیان کی بھی بہت زیادہ اہمیت ہے جو ملکہ وکٹوریہ کے ذریعہ نومبر ۱۸۵۸ء کو ہندوستانیوں سے امن کے لئے کی گئی اپیل (اعلانیہ) کے جواب میں حضرت محل نے نومبر ۱۸۵۸ء ہی میں بونڈی سے جاری کیا تھا جس میں انھوں نے انگریزی حکومت کے مکر و فریب کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ہندوستانی باشندوں سے کہا گیا تھا کہ ایسے سنہرے خوابوں کے جھانسے میں نہ آئیں جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں۔ ناگری اور فارسی رسم الخط میں جاری اس بیان کو سب سے زیادہ تابناک پہلو میں پنہاں، بے چینی اور فکری سیاق سباق کی اہمیت تھی۔ بنگال، بہار، کرناٹک، مدراس، مہاراشٹر، پنجاب اڑیسہ غرضیکہ ان تمام ریاستوں کے جہاں انگریزوں نے اپنے مکر و فریب اور وعدہ خلافی کر کے وہاں کے جائز راجاؤں کو اقتدار سے معزول کر دیا تھا یا ان کے حقوق چھین لئے تھے ان سب کی مثالیں اس بیان میں موجود ہیں۔ اس سے جنگ کے سیاق و سباق میں وسیع تر ہوئے ہیں وہ لوگوں میں یہ یقین کرانے میں کامیاب رہیں کہ ظالم انگریزوں کے خلاف جنگ ہی ایک واحد متبادل ہے اور یہ کہ ان پر یقین کرنا خود کو دھوکہ دینے جیسا ہے انھوں نے مذہبی جذبات اور ذات پات کے تشخص کے سوال بھی اٹھائے واقفیت کا کچھ اندازہ ایک انگریز مورخ کے اس تذکرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

> "باغیوں کے سبھی جتھوں کے ساتھ ان کے ہم وطنوں کی دلی ہمدردی تھی یہی سبب ہے کہ ان میں قوت اور جوش کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ لوگ بغیر سامان رسد جہاں چاہتے چلے جاتے۔ ہر جگہ انھیں لوگ پکا پکایا کھانا پہنچا دیتے۔ وہ لوگ بغیر چوکی پہرہ کے اپنا سامان جہاں چھوڑ دیتے۔ لوگ ان کے اسباب کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ انھیں ہمیشہ انگریزوں کے حالات کا صحیح صحیح پتہ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کے چھ مہینے بعد تک صوبہ اودھ انگریزوں کے قابو میں نہ آ سکا۔ وقتاً فوقتاً شنکر پور، ڈھونڈھیا، کھیڑا، رائے بریلی، سیتاپور وغیرہ میں برابر لڑائی ہوتی رہی۔"

صحیح معنوں میں پہلے وہ عوامی جنگ نہ رہی ہو لیکن اس کی

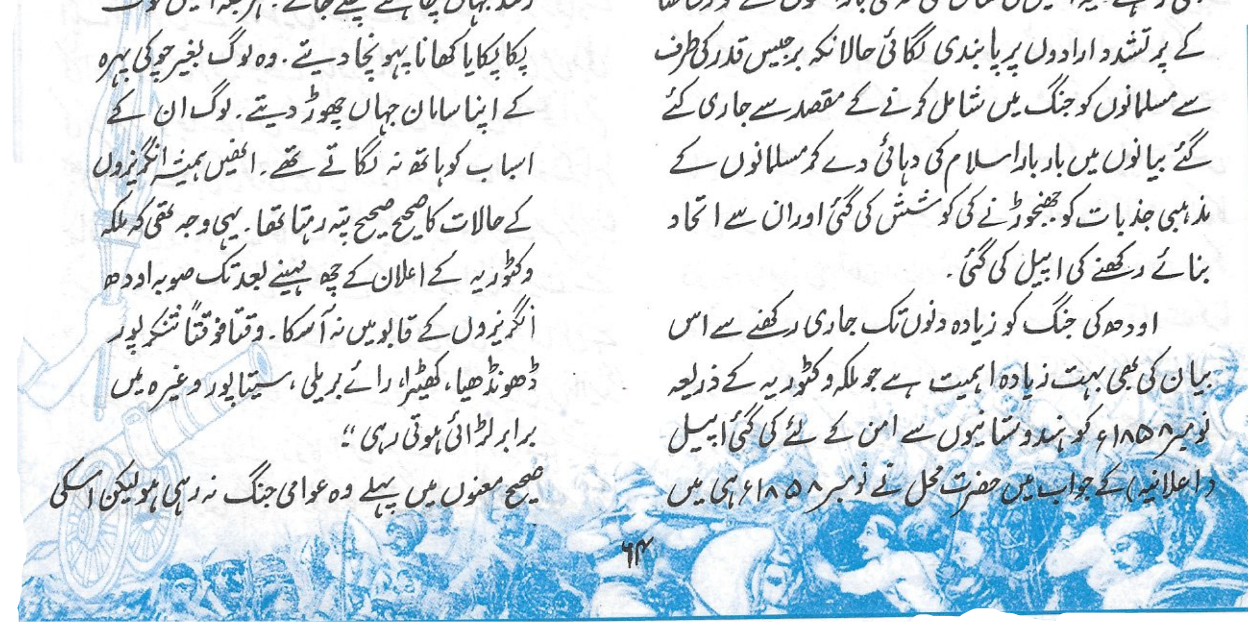

شروعات اسی سمت میں تھی۔ عوامی جنگ کی سربراہی کے لئے عوام کی بڑی حمایت چاہیئے۔ یہ حمایت اودھ میں موجود تھی۔"

(رام بلاس شرما۔ ص ۴۶)

یہاں امرت لال ناگر کی یہ تحریر بھی پڑھتے چلیں۔

"ان کے لہجہ میں بلاشبہ بڑی کشش ہوگی اور اسی سے مجھے لگتا ہے کہ وکٹوریہ کے اعلانیہ کے جواب میں بیگم حضرت محل کے تاریخی اعلان کا مضمون از خود ان کا تحریر کیا گیا ہوگا بیگم حضرت محل کی تنظیم تنظیمی قوت واقعی اعلیٰ درجہ کی تھی۔

(غدر کے پھول۔ امرت لال ناگر ص ۱۷۱)

ضرور ہی یہ سیاق سباق متعجب کرتا ہے کہ فتح کی امیدیں جب مسلسل کم ہوتی جا رہی تھیں تب کئی راجاؤں، تعلقداروں، جرنلوں اور ہزاروں فوجیوں کے ساتھ بونڈی (بہرائچ) میں راجہ دیوی بخش سنگھ، بروا کے ٹھاکر گلاب سنگھ، راجہ دگیہ وجے سنگھ راجا نرپت سنگھ، راجہ بینی مادھو بخش بہادر، اجردا کے راجہ جوت سنگھ، چودھری مصاحب علی، ممو خاں، آنندی کری اور تجمل حسین خاں وغیرہ بیگم کے کسی معجزاتی اشارے کے منتظر تھے۔ بیگم کوئی اشارہ کرتیں اس سے قبل لارڈ کلائڈ کی فوج نے انھیں گھیر لیا اور بالآخر انھیں بھاگ کر نیپال کے انگریز نواز راجا کی پناہ لینی پڑی حالانکہ ان کے ساتھ پورا ایک جلوس نیپال کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔ لیکن وہاں کے راجہ نے صرف ۲۰ لوگوں کو پناہ دینے کی اجازت دی۔ سرہوپ گرانٹ نے اپنی کتاب میں بیگم کے ساتھ نیپال جانے والی جس فوج کا تذکرہ کیا ہے ان میں انفیلڈ رائفل بردار فوجیوں کا بھی تذکرہ ہے۔ انھیں نئی رائفلوں کے کارتوس پر ستّاون کے انقلاب کی ذمہ داری رکھی گئی ہے۔

(امرت لال ناگر۔ غدر کے پھول)

بعد میں ایک شعر کافی مقبول ہوا ہے

نہ ایران نے کیا نہ شاہ روس نے
انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے

انگریزوں کی گرفت سے بیگم کو خود کو بچائے رکھنا بامعنی ہے لیکن جن شرائط کی بنیاد پر انھوں نے نیپال میں پناہ لی۔ کیا وہ ان کی شاندار شخصیت کا افسوسناک باب نہیں ہے۔

نیپال نریش کا انگریزوں سے زبردست مقابلہ کرنے والی بیگم کو پناہ دینا اور ۵۰۰ روپیہ ماہانہ کی پنشن (جسے بعد میں اضافہ کر کے ۱۵۰۰ کر دیا گیا) دینا کس بنیاد پر منظور کیا؟ اس شرط نامہ اور بیگم کے خزانے کا بڑا حصّہ حاصل کر لینے کی وجہ نہیں؟ بہرحال ۷ اپریل ۱۸۵۹ء کو نیپال میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ وہیں ان کی تدفین ہوئی۔

یہ سوال باقی رہا کہ جس خاتون نے بہت زیادہ مشکلات میں سرنگوں نہ کیا ہو اسے کن ناساز گار حالات نے شکستگی کی نفسیات کے قریب لا کھڑا کیا؟ بیگم نے اپنے شوہر اور ان کے کچھ بزرگوں کے ذریعہ دہلی سے اقتدار کی خلاف ورزی کے باوجود جہاد عظیم پر پہونچی۔ جنگ کے دنوں میں دہلی کی سلطنت بہادر شاہ ظفر کے مددگاروں اور وہاں کی فوجی کمیٹی کو پوری عزت بخشی۔ یہ اتفاق نہیں تھا کہ دہلی کی شکست کے بعد لکھنؤ اور اس کے قریب میں چل رہی آخری جنگ ہی مغل شہزادوں، جنرل بخت خاں اور وہاں سے آئے ہزاروں فوجیوں کی مورچہ بندیوں نے بیگم اور ان کے معاونین کو شرمناک شکست سے بچا لیا تھا۔ اس رشتہ کو بیگم نے نیپال میں ہی پناہ لئے مغل شہزادے مرزا داؤد بیگ کی دختر مختار النساء سے اپنے فرزند برجیس قدر کا نکاح کرا کے اس رشتہ میں نئی روح پھونک دی۔

نواب واجد علی شاہ اختر نے اپنی ایک غزل میں اس محبوب بیگم کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

ابھی ڈر سے چھپ جائے سارا جہاں
اگر تو پلک مار حضرت محل
کہاں ہے، کہاں ہے، کہاں ہے کہاں
ارے اختر زار حضرت محل

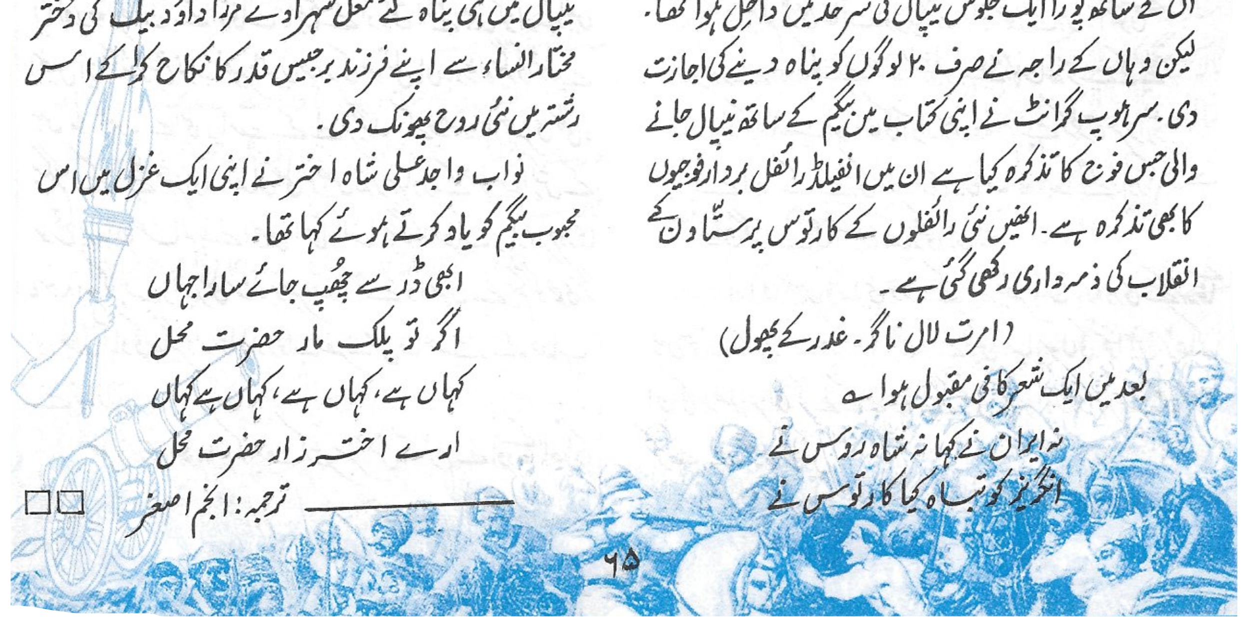□□ ترجمہ: انجم اصغر